

# عائلی قوانین

## مولانا داؤد غزنوی کے خیالات پر ایک تنقیدی نظر

— (جناب! نعیم صدیقی صاحب) —

عائلی قانون کا مسئلہ نہ تو محض عائلی ہے نہ محض قانونی۔ بلکہ یہ معاملہ ذرا زیادہ گہرا ہے اور بڑے پیچیدہ مضمرات رکھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا موجودہ معاشرہ اسلام کے اصولوں پر صحیح طور سے قائم نہیں رہا ہے، اس لیے ہر دوسرے شعبے کی طرح ہمارے عائلی شعبے میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ مگر انسانی دنیا کے حجابات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لمبا اوقات اصلاحات ہی کے خوبصورت عنوان سے بگاڑ پھیلانے لگے ہیں۔ بہت سے وہ عناصر جن سے دین حق کا خطاب یہ تھا کہ لَا تَقْسِدُوا فِي الْأَرْضِ، انہوں نے جوانی دعویٰ یہ کیا کہ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ۔ مطالبہ تھا کہ بگاڑ نہ پھیلائیے، جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کے علمبردار ہیں۔ ہمارے عائلی مُصلِحین کو بھی عائلی اصلاح سے زیادہ خود اسلام کی اصلاح کرنے کا فکر ہے۔

نظر ثانی آویزش | ہمارے ہاں کے زیر بحث — مگر حیر سے ٹھونسنے ہوئے — عائلی قوانین کو اگر ان کی سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھیے تو آپ یہاں دو مختلف نظریاتِ حیات اور دو متضاد تہذیبوں کی آویزش دیکھیں گے۔ مغربیت (WESTERNISM) جس نے خیالات و تصورات کے دائرے سے معرکہ کا آغاز کیا تھا، اب صدی بھر میں بہت سے مراحل طے کر کے مسلمانوں کے پرسنل لاکے محفوظ ترین دائرے میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں بیچار کر رہی ہے۔ یعنی اب مخالف تہذیب کے عساکر آخری قلعہ کی دیواریں توڑ کر عین حرمِ سہرا میں ٹکس رہے ہیں۔

یہ جارحانہ پیش قدمی جس محاذ کی منت کش ہے اس کی ترتیب قابل ملاحظہ ہے۔ آگے آگے چند بیگناہ دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے پیچھے پرستار ان فرنگ کا مختصر سا طبقہ ہے۔ پھر ان کے پیچھے سنے مجتہدین ہیں جو ماڈرن اسلام کا پیکر تادیل کی چھینی اور انکار سنت کے ہتھوڑے کی ضربوں سے تراش رہے ہیں۔ پھر ان سے پیچھے کمال ازم کی صہبا کے سرمست ہیں جو چاہتے تو یہ ہیں کہ ایک ہی انقلابی فہمے میں نظریہ اسلامی کا قلاوہ اتار پھینکیں اور قوم اگر نہ مانے تو اس کے خون سے ہاتھ رنگیں، مگر غلامی نے ان میں اس سے زیادہ کوئی صلاحیت رہنے نہیں دی کہ وہ پیچھے بیٹھ کر سلسلہ جنبانی کرتے رہیں۔ پھر آخر میں بیرونی مربیان کرام آتے ہیں جو اس پورے محاذ کی نشت پناہی کر رہے ہیں۔ یہ ماڈرن اسلام کا پہلا عملی تجربہ ہے۔ اگر اس وقت یہ بڑھا ہوا قدم جم گیا تو پھر پیش قدمی دوزنک جاری رہے گی۔ اس پہلے قدم کو روکنے کا یہی وقت ہے۔ یہ سانپ اگر نکل گیا تو پھر مکیر بیٹھنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

علماء کا متحدہ محاذ قابل صد تعریف ہیں وہ علمائے کرام جنہوں نے عالمی اصلاحات کے اقدام کی ان گہرائیوں کو سمجھا اور ان پر اسلامی قانون کے نقطہ نظر سے بروقت اطمینان بخش اور بھرپور تنقید کی۔ ہم اس بات پر بھی ان کے ممنون احسان ہیں کہ دو نظریوں اور تہذیبوں کے تصادم کے ایک نازک مرحلے میں تمام کلامی اور فقہی اور گروہی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے ایک متحدہ و متفقہ آواز اٹھائی۔ مسئلہ دستور کے بعد یہ دوسری ترین مثال ہے کہ مختلف مدارس فکر سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام نے عالمی ظرفی اور وسیع النظری سے کام لے کر ملک بھر میں ایک متحدہ محاذ کا منظر پیش کر دیا۔ یہ ان علماء کا کارنامہ ہے جن کو برسوں سے یہ طعنے دیئے جاتے رہے ہیں کہ ان میں سے دو عالم بھی کسی بات پر متفق نہیں ہو سکتے، اور دوسری طرف طعنہ دینے والے طبقوں کا حال یہ ہے کہ جب پاکستان بنا ہے، وہ فکری لحاظ سے انتشار کا شکار ہیں اور سیاسی لحاظ سے مسلسل دست بگیاں۔

واحد صدائے اختلاف لیکن بد قسمتی سے یہاں ایک اشتنا پیدا ہو گیا ہے اور اختلاف کی کم سے کم ایک آواز بلند ہو ہی گئی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلم فیملی لاز آرڈی ننس ۱۹۶۱ء کے سامنے آنے پر مختلف مدارس فکر کے چند معتد اور نمائندہ علماء لاہور میں سر جوڑ کر بیٹھے، عالمی قوانین کا گہرا تنقیدی جائزہ لیا، ان کے متعلق غور و بحث کے بعد اشاعت کے لیے ایک تبصرہ مرتب کیا اور اس پر دستخط ثبت کیے۔ علماء کی اس مجلس میں جہاں دیوبندی، بریلوی اور شیعہ سربراہ موجود تھے وہاں اہل حدیث کی نمائندگی بھی قابل اطمینان حد تک تھی۔ متفقہ تبصرہ کے ابتدائی دستخط کنندگان میں مولانا حافظ محمد عبداللہ روپڑی، مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی اور مولانا حافظ محمود احمد روپڑی کے علاوہ مولانا عطاء اللہ حنیف صدر جمعیت اہل حدیث لاہور بھی شامل تھے اور مزید قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا عطاء اللہ حنیف محض بطور خود شریک نہیں ہو گئے تھے بلکہ مولانا داؤد غزنوی صدر جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان نے بوجہ علامت اس مجلس میں شریک ہونے کے لیے اُن کو اپنی طرف سے مامور فرمایا تھا۔ انہوں نے غور و بحث میں پوری دلچسپی لی، مسودہ کی تکمیل میں ان کا پورا پورا حصہ شامل ہے، اور پھر انہوں نے شرح صدر سے اس پر دستخط ثبت فرمائے۔

اس کے بعد جب یہ متفقہ مسودہ توثیق مزید کے لیے مولانا داؤد غزنوی کی خدمت میں لے جایا گیا تو انہوں نے اسے غور و خوض کے لیے رکھ لیا۔ غور و خوض نے اتنا طول کھینچا کہ اسی دوران میں حکومت کو علماء کی مشاورت اور ان کے متفقہ تبصرہ کا پُر اظہار علم ہو گیا اور لاہور کے تمام پریسوں اور اخبارات کو اس کی اشاعت سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد تبصرہ کے دستخط کنندگان کے خلاف تفتیشی کارروائی شروع ہو گئی۔ ان کو دفتر سی۔ آئی۔ اے میں طلب کیا گیا اور حکام — اور وہ بھی فوجی دور کے حکام — کے گرم تیور سامنے آ گئے۔ اُس وقت پہلی مرتبہ مولانا داؤد غزنوی صاحب نے الاعتصام مؤرخہ مارچ ۱۹۶۲ء میں اختلاف کی آواز اٹھائی اور اب دوبارہ انہوں نے الاعتصام مؤرخہ ۹ اگست ۱۹۶۲ء میں اس کا اعادہ فرمایا ہے۔

قرار دادِ دعوتِ اتحاد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا داؤد غزنوی کے اختلافی مضمون کا مطالعہ کرنے سے پہلے دعوتِ اتحاد کی اُس قرار داد کو ذہن میں تازہ کر لیا جائے جو جمعیت اہل حدیث

مغربی پاکستان کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۲، ۳، ۴ نومبر ۱۹۶۲ء میں بمقام لاہور پاس ہوئی تھی اور جو صاف طور پر جمعیت کی اکثریت کے جذبات کی ترجمان ہے۔ اس قرارداد کے مخاطب وہ تمام افراد، تمام حلقے اور تمام جماعتیں ہیں جو کتاب و سنت کو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس سمجھتی ہیں اور اس ملک کی وہ فکری وحدت جس پر اس کی تشکیل ہوئی ہے، برقرار رکھنا اپنا نصب العین اور فرضیہ تصور کرتی ہیں۔ ان جماعتوں سے اپیل کی گئی ہے کہ:-

”اپنی تمام توجہات اختلافی مسائل سے ہٹا کر اسلام کی بنیادوں کی حفاظت اور ان کے استحکام پر صرف کریں اور اس بات کا عزم صمیم کر لیں کہ کم از کم اس وقت تک جب تک کہ اباحت پسندی اور بے دینی والحاد کے اس طوفان کا زور ٹوٹ کر فضا معمول پر نہ آجائے، وہ اپنی توجہات فروعی اور اختلافی مسائل پر صرف کرنے کے بجائے اس حملہ کی ملامت پر صرف کریں گے جو دین کی بنیادوں پر کیا جا رہا ہے۔“

..... تاکہ کوئی شخص یا گروہ الحاد پسندوں کی وسیع کاریوں کا شکار ہو کر نہ رہے۔  
یانا والستہ ان کا آلہ کار نہ بن جائے، کیونکہ یہی چیزیں دین کی جڑوں پر کلہاڑا چلانے والوں کے لیے سب سے زیادہ معین و مددگار ہو سکتی ہیں۔“

کاش جمعیت اہل حدیث کی اس قرارداد کو صدر جمعیت خود ہی پس پشت نہ ڈال دیتے اور عالمی قوانین کے پس منظر میں اباحت پسندی اور مغربیت کا جو فتنہ چھپا ہوا ہے اسے اچھی طرح دیکھ سکتے۔  
مولانا داؤد غزنوی تو بہت بڑی عالمانہ شخصیت سے آراستہ ہیں، ایک پڑھا لکھا اسلام پسند عامی بھی بخوبی اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ عالمی قوانین کا معاملہ محض چند قانونی دفعات اور چند فقہی جزئیات کے اول بدل کا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر مغرب پرستوں کا ذوق تحریف و تاویل روح بن کر کام کر رہا ہے اور اس روح بد کو منکرین حدیث نے بیہوش دے کر غاص قرآنی شان عطا کر دی ہے۔  
اس کا اصل رخ اسی ”آبادت پسندی، بے دینی اور الحاد“ کی جانب ہے جس کے خلاف قرارداد اتحاد

میں متحدہ جدوجہد کی دعوت دی گئی ہے۔ مولانا غزنوی نے اگرچہ عائلی قوانین کا جائزہ من حیث اکل اپنی اختلافی گفتگو میں لیا ہی نہیں بلکہ محض اس کی دفعات کو الگ الگ کر کے دیکھا ہے، پھر بھی ایک آدھ بار ان کی توجہ ان قوانین کی فاسد فکری روح کی طرف گئی ضرور ہے اور کم از کم طلاق کی دفعات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے قلم سے یہ فقرہ ایک جگہ صادر ہو ہی گیا ہے کہ :-

”اس دفعہ میں (یعنی دفعہ نمبر ۷) طلاق کے لیے جو دفعات تجویز کی گئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کسی ایسے شخص یا اشخاص نے مرتب کی ہیں جو کتاب و سنت سے بالکل ناواقف، یا دیدہ و نہشت احکام کتاب و سنت کو پس پشت ڈال کر جدید احکام وضع کرنا چاہتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے بہت بے چین ہیں۔“

جی ہاں، پورے عائلی قوانین کے پیچھے ایسا ہی ذہن کا فرما ہے جو کتاب و سنت سے ناواقف بھی ہے، کتاب و سنت کو پس پشت ڈال کر جدید احکام دیکر جدید اسلام، وضع بھی کرنا چاہتا ہے، اور جو کوئی اس کے پیچھے نہ چلے اسے سزا بھی دینا چاہتا ہے۔ اصل ڈرائی اسی ٹیڑھے ذہن کے خلاف تھی، جس کی ذمہ داری کو نبھانے کے بجائے آپ نے عائلی قوانین کے اندر سے کچھ اچھے اجزاء تلاش کرنے کی کاوش کو اپنے لیے پسند کر لیا۔

بہر حال عائلی قوانین کی فاسد فکری روح کے خلاف جب پورے پاکستان کے علماء کا متحدہ محاذ بن چکا تو آپ نے اٹھ کر اس میں اختلاف کی ایک دراڑ پیدا کر دی۔ آپ کے قلم نے اس مضمون کو بکھر سخی اقامت دین کی تاریخ کے زیرِ تسوید و رقی پر ایک ایسا دھتے ڈالا ہے جو بار بار آپ کے سامنے آئے گا اور وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا جاتے گا۔ اسے دیکھ کر کسی لمحے خود آپ کو بھی سخت احساس ہوگا۔ یہ لمحہ جتنا جلد آجائے اتنا ہی اچھا ہے، ورنہ زیادہ دیر گزرنے پر اس کی تلافی کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

مولانا داؤد غزنوی کا فلسفہ اعتدال | علماء کے متفقہ تبصرے سے اختلاف کرنے کے لیے جو موقف

محترم مولانا داؤد غزنوی نے اختیار کیا ہے وہ بے حد دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ اس کے لیے ایک مناسب فلسفہ اعتدال وضع کیا گیا ہے جس کا وعظ کچھ مدت سے الاعتصام کے صفحات میں نشر کیا جا رہا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

”..... عالمی قوانین کی حمایت اور اس کی مخالفت میں اعتدال کی راہ اختیار نہیں کی جا رہی ہے۔ کافر نس کی راستے میں اس کی بعض دفعات تو بے شک نصوص شرعیہ کے مخالف ہیں، لیکن بعض دفعات اصلاح طلب اور بعض قابل قبول ہیں۔“

”جماعت اہل حدیث کی راستے میں یہ دونوں راہیں افراط و تفریط کی ہیں اور حدود اعتدال و توازن سے دور تھیں۔“

”..... لیکن لوگوں نے اس کی مخالفت و موافقت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے وہ حد اعتدال سے ہٹا ہوا ہے۔“..... علامہ دکن پر جیسے کہ وہ مخالفت و موافقت میں حد اعتدال سے آگے نہ بڑھا کریں۔“

”ہمارے خیال میں اس میں افراط و تفریط کا جذبہ زیادہ کار فرما رہا ہے۔ ہر فرقہ نے اس کی انتہا کو اختیار کیا، یعنی یا تو اس کی انتہائی مخالفت کی یا انتہائی موافقت۔“..... ان دینی علماء کے منصب بلند کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ بھی عوام کی طرح افراط و تفریط کا شکار ہو جائیں۔“

کیا عجیب نقشہ احوال ہے کہ عین اُس وقت جبکہ ایک فکری معرکہ درپیش ہو اور اس سے ٹھہرنا ہونے کے لیے تمام دینی عناصر متحد ہو رہے ہوں، آپ اٹھیں اور اعتدال کا وعظ شروع کر دیں۔ بجائے اس کے کہ اعتدال کی دعوت خود مجلس علماء ہی میں دی جاتی، یا کسی دوسرے موقع پر از سر نو مجلس علماء بلالی جاتی، یہ آخر کیا مسلک اعتدال ہے کہ آپ پریس ادیلیٹ فارم کے ذریعے متحدہ علماء پر تنقید فرماتے

لہ الاعتصام مورخہ ۹ نومبر ۱۹۷۳ء ص ۵۔ یہ عبارت اگرچہ جمعیت کی سائنہ کانفرنس کی قرارداد سے لی گئی ہے مگر جمعیت کے ذمہ دار حلقوں سے نہیں معلوم ہوا ہے کہ یہ قراردادنا بطور کے مطابق مجلس شوریٰ میں زیر بحث نہیں لی گئی تھی۔

لہ ادارہ الاعتصام ۹ نومبر ۱۹۷۳ء ص ۳۔ الاعتصام ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء ص ۵۔ الاعتصام ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء ص ۵۔

ہیں اور ان پر افراط و تفریط کا الزام عائد کر کے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا ایک آپ ہی ہیں جو راہ اعتدال پر قائم رہ گئے ہیں۔ یہ پوزیشن ہے تو بڑی شاندار کہ آپ اسلامی اور مغربی رجحانات کی آویزش میں اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے بجائے بالکل غیر جانب دارانہ شان سے مقامِ اعزاف پر کھڑے ہوں اور دونوں فریقوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہوئے اپنے فلسفہ اعتدال کے ترازو میں تول رہے ہوں۔ مگر یہ بھی تو سوچیے کہ اس پوزیشن کو اختیار کرنے کے خوفناک فوری اثرات کیا ہیں؟ — یہ کہ بے دینی، الحاد اور اباحت پسندی کے علمبرداروں کو متحدہ علماء کے خلاف خود علماء ہی میں سے ایک گواہ اپنے حق میں مل جاتے جو ان کے خلاف افراط و تفریط کا چارج شدید لگا رہا ہو۔ ہم ہرگز نہ یہ سوچیں نہیں کر سکتے کہ مولانا غزنوی دیدہ دانستہ غلط عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے پر کبھی تیار ہو سکتے ہیں مگر نادانستہ سہی، امر واقعہ تو اس یہی ہو گیا ہے — اور ایسے دینی حلقے کی طرف سے ہو گیا ہے جو دوسروں کو متنبہ کر رہا تھا کہ ”کوئی شخص یا گروہ الحاد پسندوں کی دسیسہ کاریوں کا شکار ہو کر دانستہ یا نادانستہ ان کا آلہ کار نہ بن جاتے۔“

اس فلسفہ اعتدال کے نتائج | بدقسمتی سے محترم مولانا داؤد غزنوی اور ادارہ الاعتصام نے فلسفہ اعتدال کی جو راہ اختیار کی ہے وہ انہیں کہیں کا کہیں لے گئی ہے شروع میں بات اس مقام سے چلی تھی کہ عالمی قوانین میں بعض باتیں اچھی ہیں، بعض قابل ترمیم و اصلاح ہیں اور بعض ناقابل قبول ہیں مگر سمجھوتے کا یہ اندازِ نظر بالآخر ان کو جہاں لے آیا وہ یہ مقام ہے کہ:

”..... اس اتنے بڑے پندے میں آخر کوئی چیز تو صحیح ہوگی۔“ اس کا آخر کوئی

پہلو تو صحیح اور لائق التفات ہو گا۔

یہ چند الفاظ ایسے ہیں کہ ان میں اس کمزور طرزِ فکر کی پوری پوری پرچھائیں سامنے آگئی ہے جو فلسفہ اعتدال کے پیچھے کام کر رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ کونسا نظریہ، نظام، دستور، یا تہذیب ہے جس میں باطل اور شر کے ساتھ سرے سے حق اور خیر کا کوئی جز نہ پایا جاتا ہو۔ بڑے سے

بڑا کفر بھی کچھ نہ کچھ اجزائے حق اپنے ساتھ لے کر ان کے سہارے قائم ہوتا ہے۔ میرا یہ داری اور شریعت ہو یا قادیانیت و پرویزیت، ان کے پلندوں میں بھی کوئی نہ کوئی اچھی بات ضرور نکل آئے گی۔ پھر کیا ان سب کے ساتھ بھی وہی "اعتدال" کا معاملہ کیا جاتے گا جو عالمی قوانین کے بارے میں تجویز کیا جا رہا ہے۔ قابل گرفت مسلمان [فی نفسہ اختلاف قابل گرفت چیز نہیں ہے، البتہ جب اختلاف غلط موقع پر اور غلط طریق سے کیا جاتے تو وہ قابل گرفت ہو جاتا ہے محترم مولانا داؤد غزنوی۔ ادارہ الاعتصام اور ان کے ہم خیال حضرات نے ایسے "تبع پر اور ایسے طریق سے اختلاف کیا ہے کہ ہر ذی شعور مسلمان کے لیے اس کا نوٹس لینا ضروری ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں :-

۱) اختلاف کرنے کا واحد محل متفقہ تبصرہ مرتب کرنے والی مجلس علماء کے اندر تھا، جس میں مولانا داؤد غزنوی بہ نفس نفیس اگر شریک نہ تھے تو کم سے کم ان کے مامور کردہ یا ان کے افن یا فتنہ نمائندہ مولانا عطاء اللہ حنیف موجود تھے۔ اس مجلس میں جو تبصرہ مرتب کیا گیا تھا اس سے اگر مولانا کو اختلاف تھا تو وہ مطالبہ کر سکتے تھے کہ مجلس کا اجلاس پھر بلایا جائے جس میں وہ بھی شریک ہوں۔ اس مجلس کے باہر اختلافی آواز اٹھانا کیسے مناسب تھا؟

۲) اس تبصرے پر دستخط کرنے والے بعض دوسرے علماء بھی کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتے تھے، مگر انہوں نے علماء کے اتفاق کو نقصان پہنچاتے بغیر اس پر اپنے اختلافی نوٹ ثبت کر دئے اور بعد میں آج تک کوئی اختلافی آواز نہ اٹھائی۔ مثلاً مولانا حافظ محمد عبداللہ روپڑی نے اس نوٹ کے ساتھ دستخط کیے :

”مضمون بالا کی بعض جزئیات اگرچہ تفصیل طلب یا غور طلب ہیں، مگر اصل مقصد

کے لحاظ سے میں اس پر دے مضمون سے متفق ہوں۔“

اسی طرح مولانا حافظ کفایت حسین صاحب مجتہد دارۃ عالیہ تحفہ حقوق شیعہ پاکستان، نے

حسب ذیل نوٹ کے ساتھ دستخط ثبت کیے :-

”پہلے : مسٹر فہمی لازاروئی نے پاکستان کے علماء کا تبصرہ ”تبدیلیا“ شیل محمد بی کے بارے میں بی بی سی

”مجھے اصل دفعات سے وہی اختلاف ہے جو اس مضمون میں ظاہر کیا گیا ہے، لیکن ان دفعات کی وضاحت میں جو امور تحریر فرمائے گئے ہیں، ان کے بعض اجزاء سے اتفاق نہیں ہے۔“

مولانا حافظ کفایت حسین کا فقہی نقطہ قطر جمہور علماء اہل سنت سے بہت زیادہ مختلف ہے، بقابلہ اس اختلاف کے جو عام اہل سنت اور اہل حدیث کے درمیان ہو سکتا ہے۔ مگر حافظ صاحب نے عظیم تر مصلحت دینی کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے اختلاف کو درکار رکھ کر علماء کی متحدہ آواز کا ساتھ دیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر محترم مولانا داؤد غزنوی ہی کے لیے کونسا ایسا محرک شدید تھا جو اس میں آرٹسے آیا کہ وہ دستخط کرنے میں لیت و لعل دکھائیں اور پھر اپنے اختلافی نقطہ نظر کو ضرور سامنے لاکر ہی رہیں؟

(۳) پھر اگر انہیں اپنی اختلافی راستے لانا ہی ضرور تھا تو کیا یہ کافی نہ تھا کہ کسی شکل میں وہ ایک بار سامنے آجائے اور اتمام حجت ہو جائے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک ہی بات پہلے، اربابِ ائمہ کے الاعتصام میں سامنے لائی جاتی ہے، پھر نومبر ۱۹۸۲ء کی اہل حدیث کانفرنس میں اسے ایک قرارداد کی شکل میں دہرایا جاتا ہے، پھر الاعتصام پے درپے اس پر مضامین لکھتا ہے اور آخر کار محترم مولانا داؤد غزنوی پورا ایک مضمون تحریر فرماتے ہیں۔ اس کے لیے اتنا تکرار و اصرار کیوں ہے؟

(۴) پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مولانا داؤد غزنوی کا فلسفہ اعتدال پر مبنی اختلافی مضمون عین اس زمانے میں نشر ہوتا ہے جبکہ عائلی قوانین کی تنسیخ کے لیے ملک بھر کے عوام متحدہ آواز بلند کر رہے ہوتے ہیں، جبکہ صوبائی ایوان میں تنسیخ کی قرارداد پاس ہو چکی ہے اور جبکہ قومی اسمبلی میں وہ معرض بحث میں ہوتی ہے۔ کیا یہ عین ایسے وقت میں کند توڑنے کی کوشش نہیں ہے — خواہ ناواستہ ہو — جبکہ مسئلہ لب بام سے دوچار ہاتھ دے ہو؟

۵۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ نومبر ۱۹۸۲ء کی اہل حدیث کانفرنس میں عائلی قوانین

پر غور کرنے کے لیے گیارہ افراد پر مشتمل جو بورڈ بنایا گیا تھا اس نے ان قوانین پر اپنا کوئی تبصرہ مرتب کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو اسے کیوں شائع نہ کیا گیا؟ اور اگر نہیں کیا ہے تو بورڈ کو نظر انداز کر کے خود صدر جمعیت بالابالا اپنی انفرادی راستے کی نشر و اشاعت کیسے فرما رہے ہیں؟

اب ہم محترم مولانا داؤد غزنوی کے اصل مضمون کا جائزہ لیتے ہیں جو متحدہ علماء کے تبصرے کے مقابل میں شائع کیا گیا ہے۔

**لغزشیں نظر** | یہ مضمون صاحب مضمون کی جس سب سے بڑی لغزش نظر کو سامنے لاتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ یعنی مولانا نے عائلی قوانین کی وضاحت کو جزو بہ جزو تو دیکھا اور وہ اس کے بڑے اجزاء میں سے ہر صد کاوش اچھے اجزاء کی تلاش فرماتے رہے مگر انہوں نے کل کو بیک نظر نہ دیکھا۔ انہیں پہلے یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ ان قوانین کی مجموعی ہیئت کیا ہے؟ یہ معاشرہ کس رخ کی طرف لے جانے والا فراموش رکھتے ہیں؟ ہمارے ملک کے کون سے عناصر نے یہ طرز فکر اُبھارا ہے؟ تعلیم پوتے کی بحث کہاں سے چلی؟ تعددِ ازواج کے بارے میں منہگامہ کا آغا نہ کس طرح ہٹا؟ طلاق کا انوکھا ضابطہ کہاں سے آیا؟ کن حالات میں پہلا کمیشن مقرر کیا گیا تھا؟ اس کمیشن میں افراد کس قسم کے لیے گئے تھے؟ پھر ان قوانین کو کس غیر جمہوری طریق سے اکثریت پر جبر کر کے ٹھونسا گیا ہے؟ ان تمام امور کو نظر انداز کر کے انہوں نے قانون کی دفعات کو صرف اس لحاظ سے دیکھنا شروع کر دیا کہ اس میں کون سے اجزاء درست اور کون سے غلط ہیں۔ یہ بانگی ایسا ہی ہے جیسے ہم ایک عمارت کو صرف اس لحاظ سے دیکھیں کہ اس میں اینٹیں، کڑیاں، ستون، دروازے اور کھڑکیاں کہاں کہاں ٹھیک اور کہاں غلط ہیں۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عمارت مجموعی طور پر کس نوعیت کی ہے اور کس مقصد سے کس نقشے پر بنائی گئی ہے۔ وہ عدالت ہے؟ سکول ہے؟ دفتر ہے؟ مندر ہے؟ میخانہ ہے؟ اصطبل ہے؟ ہوٹل ہے؟ یا مسجد ہے؟ ظاہر ہے اس کا فیصلہ مجموعی ہیئت ہی سے ہوگا۔ عمارت اگر قبلہ رخ نہیں ہے اور مسجد کی خصوصیات و ضروریات سے خالی ہے تو اس کے کچھ اجزاء کے درست اور کچھ کے نادرست ہونے کی بحث چھیڑنا لا حاصل ہے۔ ایک اصطبل کی دو پارکڑیاں اور ستون بدل کر آپ کوئی اچھی مسجد نہیں بنا سکتے

بھی وجہ ہے کہ ملک کے علماء نے متفق ہو کر اس آرڈینیٹس کو منسوخ کرنے اور اہل علم کے مشورے سے عالمی مسائل کے متعلق ایک نیا ضابطہ مرتب کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ مولانا داؤد غزنوی اگر اس نگاہ سے پورے معاملہ کو دیکھتے تو وہ کبھی علماء کے اس متفق علیہ موقف سے اختلاف نہ کرتے۔

تعدد ازواج پر ناجائز پابندی | محترم مولانا داؤد غزنوی کا مضمون شرعی اور فقہی نقطہ نظر سے بعض ایسے خطرناک مضمرات اپنے اندر رکھتا ہے جو اس ملک میں شریعت کو منسوخ کرنے کا دروازہ کھول سکتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ تعدد ازواج پر آرڈینیٹس کی عائد کردہ پابندیوں کے حق میں جو استدلال انہوں نے کیا ہے اس سے تو کسی طرح صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

تمام اہل سنت، محدثین و فقہاء خواہ سلف کے ہوں یا حال کے، اس کو جزو ایمان بھی سمجھتے ہیں اور قانونی اصول بھی کہ نص قرآنی سے جو احکام ثابت ہوں ان میں رد و بدل کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اب دیکھیے کہ سورہ نساء میں تعدد ازواج کا حکم جہاں بیان ہوا ہے کیا وہاں اس طرح کی کوئی پابندی لگائی گئی ہے کہ ایسا قدم اٹھانے سے پہلے ایک شخص کو کسی ادارے کے سامنے پیشگی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ عدل کر سکتا ہے یا نہیں؟ ”اِنْ خِفْتُمْ اَلَا تَحٰدِلُوْا“ کے مخاطبین ٹھیک وہی ہیں جنہیں ”فَاَنْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ“ کہا گیا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا نکاح ثانی کا اقدام کرنے والے کے ذمے ہے کہ وہ بیویوں میں عدل کر سکے گا یا نہیں۔ اس معاملے میں قرآن کی نص کو سامنے رکھ کر اصلاح احوال کے لیے قانون سازی کی زیادہ سے زیادہ گنجائش اتنی ہے کہ اگر کوئی شخص تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کے بعد عدل نہیں کرتا تو اس صورت میں حکومت مداخلت کرے گی۔ اس بنا پر کہ اس نے شریعت کی دی ہوئی ایک اجازت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور ایک صاحب حق کو اس کے حق سے محروم کیا۔ اگر اس جرم کا ارتکاب کثرت سے کیا جانے لگا ہو تو حکومت اس کے لیے تعزیر بھی مقرر کر سکتی ہے، مگر قرآن کی حدود کے باہر جا کر من گھڑت قانون سازی نہیں کر سکتی۔

قرآنی نص کے حدود سے تجاوز کر کے قانون سازی کرنے کی راہ کھولنے کے لیے مولانا داؤد صاحب جو دلیل لاتے ہیں وہ یہ ہے:

”اس سے ملتا جلتا مسئلہ ہے کہ کتابیہ کے ساتھ نکاح جائز ہے اور قرآن کریم میں یہ نص صریح اجازت موجود ہے۔ اب اگر حکومت کا سربراہ یا امیر مملکت یہ محسوس کرے کہ عیسائی عورت سے نکاح از روئے قرآن کریم جائز تو ہے لیکن ہمارے ملک کے حالات ایسے ہیں کہ اس جواز پر عمل کرنے سے بہت سے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں تو امیر مملکت کو حق حاصل ہے کہ عیسائی عورتوں سے نکاح پر پابندی عائد کر دے، جیسا کہ فاروقی اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی نبیوں کو جب شام میں داخل ہوئیں اور انہوں نے عیسائی لڑکیوں سے شادیاں رچانی شروع کر دیں، حکم فرمایا کہ کوئی شخص عیسائی لڑکی سے شادی نہ کرے، اور جنہوں نے شادی کر لی ہے وہ طلاق دے دیں۔ اس فوج میں صحابہ بھی تھے اور تابعین بھی۔ کسی نے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ قرآن کریم کی صریح اجازت کے بعد آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ منع کریں۔۔۔“

ان سطروں کو پڑھ کر دلی صدمہ ہوا کہ ایک مشہور دینی حلقے کی جانب سے اب اس طرح کے طرز استدلال کا نمونہ ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم اہل حدیث علماء کو حسب ذیل نکات کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ جس معاملہ کو بناتے استدلال بنایا گیا ہے، اس میں بہ حیثیت روایت کے سخت اضطراب پایا جاتا ہے۔ اور مختلف روایات میں وہ سخت لفظی اختلافات کے ساتھ منقول ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اگر اس سے استدلال کرتے بھی ہیں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ فی نفسہ یہ روایت کیا معنی اور حیثیت رکھتی ہے؟ کیا حضرت محمدؐ کوئی عمومی فرمان امتناع نکاح کتابیات کے سلسلے میں جاری کیا تھا جس نے حلال کو حرام کر دیا ہو؟ کیا وہ حکم نکاح یا مشورہ؟ حکم تھا تو کیا وہ فوج یا انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے بعض افراد کے لیے خاص تھا، یا عام شہریوں کے لیے جاری کیا گیا تھا؟ پھر وہ ایک خاص علاقے کی خاص حالات رکھنے والی کتابیات کے متعلق تھا یا اصولی و عمومی پابندی کا حامل تھا؟

دورانِ تحریرِ راقم نے روح المعانی جزء سادس، ابن کثیر جزء ثانی، تفسیر الطبری جلد ۹، احکام القرآن ابن عربی جزء ۲، اور احکام القرآن جصاص ج ۲ میں متعلقہ مبحث کے سلسلے میں جملہ روایات و تاویلات کو چھاننا مگر حضرت عمرؓ کا ایسا کوئی فرمانِ عمومی نہ مل سکا۔ واقعہ صرف ایک حضرت خذیفہؓ کا ہے جسے جصاص نے یوں لیا ہے:

”نزوح خذیفۃ بیہودیۃ، فکتب الیہ عمرؓ ان خل سبیلہا، فکتب

الیہ خذیفۃ: احرامٌ ہی؛ فکتب الیہ عمرؓ: لا، ولکنی اخات ان

تواقعا المؤمنات منہن“ رقال ابو عبید: یعنی العواہل

اس انفرادی ہدایت کو مشورہ پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسے اگر حکم مانا بھی جائے تو یہ بالکل محدود اور خاص ہے۔ محدود اور خاص اس لحاظ سے بھی کہ اس کا خطاب فوج اور انتظامیہ کے ایک فرد یا زائد افراد سے ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی حکومت اپنی فوج اور انتظامیہ پر ایسی مختلف پابندیاں لگا سکتی ہے جو عام شہریوں پر نہیں ہوتیں، یہ محدود اور خاص اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس کا مقصود صرف ”مؤمنات“ یا ”عواہل“ یعنی بدچلن عورتوں سے بچانا ہے۔ لفظ ”مِنْتَقَات“ کا استعمال مشورہ یا حکم کو ملحوظ مدعا اور بھی اختصاص دے دیتا ہے۔ قابلِ غور یہ بات ہے کہ حضرت عمرؓ اس کی تصریح فرماتے ہیں کہ نکاح کتابیات حرام نہیں ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا کتب تفسیر و احکام میں حضرت عمرؓ کے مندرجہ بالا قول کے باوجود نکاح کتابیات کو جائز و مباح قرار دیا گیا ہے اور اس اباحت سے صحابہؓ نے عملاً فائدہ اٹھایا ہے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ نے نائلہ بنت فرائضہؓ کلبیہ (نصرانیہ) سے نکاح کیا۔ طلحہ بن عبید اللہؓ نے شامی یہودیہ سے نکاح کیا۔ خذیفہ بن الیمانؓ، کعب بن مالکؓ، مغیرہ بن شعبہؓ نے کتابیات سے نکاح کیے یا ان کو نکاح کے پیغام بھیجے۔ بلکہ حافظ

۱۔ احکام القرآن للجصاص۔ جزء ۲۔ باب تزویج الکتابیات۔ ترجمہ: حضرت خذیفہؓ نے ایک یہودیہ سے نکاح کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو کھاکہ اس کو چھوڑ دیں۔ حضرت خذیفہؓ نے جواب میں کھاکہ یہ حرام ہے؟ حضرت عمرؓ نے کھاکہ نہیں، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ تم لوگ ان کی بدچلن عورتوں میں نہ پھنس جاؤ۔

ابن کثیر فرماتے ہیں:

”فَنَكَمَ النَّاسُ نِسَاءَ أَهْلِ الْكِتَابِ، وَقَدْ تَزَوَّجَ جَمَاعَةٌ مِنَ الصَّحَابَةِ مِنَ نِسَاءِ

النَّصَارَى وَلَعَرِمُوا بِذَلِكَ بَأْسًا“

جو پہلو حضرت عمرؓ کے سامنے تھا وہ تو تمام مفسرین، محدثین اور فقہاء کے بھی پیش نظر رہا ہے اور ان سب کے ہاں عفت کی شرط پر بحث پائی جاتی ہے بعض بزرگانِ سلف نے نکاحِ کتابیات کو امکانی خرابیوں کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ کراہت کے درجے میں رکھا ہے کسی نے بھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ حضرت عمرؓ کے کسی حکم یا فرمان نے مکمل مدغم نگاہی تھی، یا کبھی کوئی عام حکم اتنا عامی جاری کر دیا تھا، اور نہ کسی نے حضرت عمرؓ کے لیے ایسے اختیارات کو تسلیم کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر آپ حضرت عمرؓ کے لیے اس معاملے میں یہ حق اور اختیار تسلیم کرتے ہیں تو پھر تطبیقاتِ ثلاثہ کے معاملہ میں کیوں حضرت عمرؓ کے باضابطہ دیتے ہوئے فیصلہ اور جاری کردہ حکم کو بھی قبول نہیں کر لیتے؟

چوتھی گزارش یہ ہے کہ اتنا بڑا اختیار کہ حالات و ضروریات کے تحت نص کے حدود سے تجاوز کر کے بھی قانون سازی کی جاسکتی ہے، ہماری نگاہ میں شائع کے علاوہ کسی بھی شخص یا ادارے کو نہیں دیا جاسکتا۔ مگر مولانا نے غزنوی کے مضمون کی مندرجہ عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس اختیار سے دور حاضر کے مسلمان ملکوں کے ہر سربراہ اور امیر مملکت کو پوری فراخ دلی سے مستحکم کر دینا چاہتے ہیں، اور گویا ساتھ ہی اذنِ عام دیتے ہیں کہ ع

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اس پہلو سے یہ عبارت ٹھیک اسی انداز پر آگئی ہے جو طلوعِ اسلام کے اوراق پر جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔ کیا مولانا نے یہ سوچا کہ دورِ حاضر میں اسلامی ممالک کے ”امیر المؤمنین“ اسلام کے ساتھ کیا کیا

۱۔ ابن کثیر ج ۲۔ تفسیر المائدہ، آیت ۵۔ ترجمہ: چنانچہ لوگوں نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کیے اور صحابہ میں سے ایک جماعت نے نصاریٰ کی عورتوں سے شادیاں کیں اور اس میں انہوں نے کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔

”اجتہادی کارروائیاں کرنا چاہتے ہیں؟ اس آرٹ میں تحریریتِ دین کا سلسلہ ایک بار چل پڑا تو پھر کہیں وہ رُکے گا؟ اور پھر غیر اسلامی ریاستیں جہاں مسلمان آباد ہیں (مثلاً بھارت) وہاں کے حکمران مسلمان حکومتوں کی نظیر سامنے رکھ کر مسلمانوں کے پرسنل کے نیچے نہ ادھیر دیں گے؟ بھارت میں تو یہ صورت حال پیدا ہوتے ہوئے رہ گئی ہے۔ ایک باریہ دروازہ کھلا تو پھر کہیں بچاؤ نہ ہو سکے گا۔

پانچویں گزارش یہ ہے کہ اگر حکومت وقت کو آپ معاشرے کے بگاڑ کی وجہ سے یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ نصوص سے آگے جا کر قانون سازی کرے تو پھر اگر حکومت اسی بگڑے ہوئے معاشرہ کے حالات کو سامنے رکھ کر طلاق کی تحریری اطلاع پیئر میں کو دینا لازم کرتی ہے یا تنہا پوتے کی حق رسانی کی ایک راہ نکالتی ہے تو اس پر آپ کو کیوں اعتراض ہے؟

چھٹی گزارش یہ ہے کہ جس اصول کی بنا پر آپ حکومت کے لیے یہ پابندی لگانا درست سمجھتے ہیں کہ نکاح ثانی کے لیے ایک شخص عدل کی پیشگی یقین دہانی کرے، اسی اصول کے تحت (حالاتِ معاشرہ کی بنا پر) پہلی بیوی کی رضا مندی حاصل کرنے کی قید کو کیوں صحیح تسلیم نہیں فرماتے؟

ان سوالات کی روشنی میں شاید آپ کی توجہ ان تضادات کی طرف جاسکے جو مضمون زیر بحث نے پیدا کر دیئے ہیں۔ اپنے ڈھب کا محض ایک نکتہ عائلی قوانین میں پا کر اس سارے پلندہ کو چند جزوی ترمیم کے ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار ہو جانا مولانا کی عالمانہ بصیرت سے فرور ہے۔ غالباً یہی وہ جزو ہے جس کے متعلق مولانا بار بار فرماتے رہے ہیں کہ اس میں کوئی نہ کوئی جزو تو اچھا بھی ہو گا۔ حالانکہ تطبیقاتِ ثلاثہ کے متعلق جو صورت عائلی قوانین میں ملے گی تو وہ بھی خود اہل حدیث کے مسلک کے مطابق نہیں ہے۔

بلکہ اگلا سوال یہ بھی ہے کہ اگر غنیم پوتے کی وراثت کے معاملے میں منکرینِ حدیث کا مسلک ملک بھر میں باعجز نافذ کر دیا جائے تو اس وقت ایسا ہی ہے تو اس پر بھی اعتراض کا کیا موقع رہ جاتا ہے؟ جب کا زور یا جس کا داؤں چل جائے وہ اپنا ہی کر گزے۔ مگر ایسے غیر صحت مندانہ جبری طریقوں سے جب کہی اعتقادی یا فقہی مسلک ٹھونسے جاتے ہیں تو ان کے خلاف خوفناک ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔

دروندانہ فکرا کرشن ان دروشتاں کے ساتھ راتوں کی دروشتاں گزارش یہ ہے کہ اکابر علمائے